علامہ اقبال کی نظم جبریل وابلیس کے دو پنجابی تراجم کا فکری واسلوبیاتی

An Intellectual and Stylistic Study of Two Punjabi Translations of Allama Iqbal's Poem "Jibreel-o-Iblees"

سید علی اصغر رضوی
ایم فل (اردو) اسکالر، مسلم یوتھ یونیورسٹی، اسلام آباد۔
اقرا فاطمہ
ایم فل (اردو) اسکالر، مسلم یوتھ یونیورسٹی، اسلام آباد۔

Syed Ali Asghar Rizvi *
M. Phil (Urdu) Scholar, Muslim Youth University, Islamabad.
Iqra Fatima

M. Phil (Urdu) Scholar, Muslim Youth University, Islamabad

Abstract

Allama Iqbal's poem "Jibreel-o-Iblees" is one of his most intellectually and artistically significant poems. Through the dialogue between Gabriel and Iblees, the poem presents complex ideas such as good and evil, obedience and denial, movement and stagnation, selfhood, trial, and human struggle. Iqbal's Iblees is not merely a conventional religious figure of evil; rather, he appears as a complex poetic symbol through which Iqbal highlights the existential role of conflict, movement, and spiritual trial in human history. This article offers an intellectual and stylistic study of two Punjabi translations of the poem by Aseer Abid and Dr. Ehsan Akbar. The study shows that Dr. Ehsan Akbar's translation is more fluent, idiomatic, and communicative, marked by Punjabi colloquial expression and folk rhythm. In contrast, Aseer Abid's translation remains closer to Iqbal's original atmosphere, philosophical seriousness, and symbolic depth. Both translators

render the tone of Iblees, Qur'anic allusions, philosophical expressions, and dialogic structure in different ways. The article concludes that these two translations should not be treated as substitutes for each other; rather, they complement each other in understanding Iqbal's thought and its Punjabi reception.

Keywords
Allama Iqbal, Jibreel-o-Iblees, Punjabi translations, Aseer Abid, Dr. Ehsan Akbar, good and evil, intellectual study, stylistic analysis

علامہ اقبال کی نظم "جبریل و ابلیس" ان کی فکری اور فنی پختگی کی نمائندہ نظموں میں شمار ہوتی ہے۔ اس نظم میں جبریل اور ابلیس کے مکالمے کے ذریعے خیر و شر، اطاعت و انکار، حرکت و جمود، خودی، آزمائش اور انسانی جدوجہد جیسے اہم تصورات سامنے آتے ہیں۔ اقبال کا ابلیس محض روایتی مذہبی کردار نہیں بلکہ ایک پیچیدہ علامت ہے جو کائنات میں تصادم، حرکت اور امتحان کے وجودی کردار کو نمایاں کرتی ہے۔ زیرِ نظر مضمون میں اسیر عابد اور ڈاکٹر احسان اکبر کے پنجابی تراجم کا فکری اور اسلوبیاتی جائزہ لیا گیا ہے۔ مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ ڈاکٹر احسان اکبر کا ترجمہ زیادہ رواں، محاوراتی اور ابلاغی ہے، جس میں پنجابی کی بول چال اور لوک آہنگ نمایاں ہیں۔ اس کے برعکس اسیر عابد کا ترجمہ اصل اقبالی فضا، فکری سنجیدگی اور علامتی گہرائی سے زیادہ قریب محسوس ہوتا ہے۔ دونوں تراجم میں ابلیس کے لہجے، قرآنی اشاروں، فلسفیانہ تراکیب اور مکالماتی اسلوب کی ترسیل مختلف انداز سے ہوئی ہے۔ مضمون کا نتیجہ یہ ہے کہ ان تراجم کو ایک دوسرے کا بدل نہیں بلکہ ایک دوسرے کی تکمیل کے طور پر دیکھنا چاہیے۔

کلیدی الفاظ : علامہ اقبال، جبریل و ابلیس، پنجابی تراجم، اسیر عابد، ڈاکٹر احسان اکبر، خیر و شر، فکری مطالعہ، اسلوبیاتی جائزہ

علامہ اقبال کی نظم 'جبریل و ابلیس' کا شمار اُن چند نظموں میں ہوتا ہے جن میں فکر اور فن باہم مربوط ہوتے ہیں۔ اس نظم میں جبریل اور ابلیس کے درمیان سوال و جواب کے ذریعے مندرجہ ذیل تصورات پیش کیے گئے ہیں۔ ۱) خیر و شر کا روایتی مذہبی تصور ۲) اطاعت و انکار کا مسئلہ ۳) حرکت و جمود کی کشمکش ۴) خودی کا اضطراب ۵) انسانی تاریخ میں شر، آزمائش اور جدوجہد کا کردار۔

اقبال کا ابلیس محض مذہبی روایت کے مطابق ایک مردود کردار نہیں ہے۔ وہ ایک ایسا شعری کردار ہے جس کے ذریعے اقبال سکون اور بے عملیکے مقابلے میں حرکت، تصادم اور تخلیقی اضطراب کو سامنے لاتے ہیں۔

خضر بھی بے دست و پا، الیاس بھی بے دست و پا
میرے طوفاں یم بہ یم، دریا بہ دریا، جُو بہ جُو
گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصہء آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو(۱)

'جبریل وابلیس' ایک مکالماتی نظم ہے۔ اس میں جبریل کو سوال کرنے والا اور ابلیس کو جواب دینے والا کردار بنایا گیا ہے۔ سوال مختصر ہیں، مگر جوابوں میں طنز، فخر، شکست اور خود آگہی ہے۔ یہاں ابلیس فقط گمراہی کی آواز نہیں بلکہ ایک ایسا کردار ہے، جو اپنی محرومی کو بھی طاقت بناتا ہے۔

اس نظم میں عربی وفارسی الفاظ، قرآنی تلمیحات، فلسفیانہ تصورات اور بلند شعری آہنگ ہے۔ پنجابی میں اس نظم کا ترجمہ کرتے وقت مترجم کو صرف لفظوں کا بدل تلاش نہیں کرنا بلکہ اسے ابلیس کے لہجے، جبریل کے سکون، سوال وجواب کی برق رفتاری اور نظم کی فکری پیچیدگی کو بھی منتقل کرنا ہے۔

اسیر عابد اور ڈاکٹر احسان اکبر نے 'جبریل وابلیس' کو پنجابی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ اس مضمون میں ان دو پنجابی تراجم کا فکری اور اسلوبیاتی جائزہ لیا جائے گا۔ دونوں مترجمین کا اسلوب، لفظی انتخاب، محاورہ، فکری ترجیح اور شعری مزاج ایک جیسا نہیں۔ ڈاکٹر احسان اکبر کے ہاں ترجمہ رواں، عوامی اور محاوراتی ہے، جب کہ اسیر عابد کے ہاں اقبال کے اصل متن سے قرب، فکری گہرائی اور لفظی وفاداری ہے۔ یہی فرق اس مضمون کے بنیادی مطالعے کا مرکز ہے۔

جبریل کی نظر میں ابلیس مردود ہے۔ وہ ابلیس سے سوال کرتا ہے کہ کیا اب بھی واپسی کی کوئی صورت ممکن ہے؟ لیکن ابلیس اس سوال کے جواب میں اپنے زوال کو محرومی نہیں بلکہ اپنی شناخت کا حصہ بتاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس نے ٹوٹ کر بھی سرمستی پائی ہے۔ یہاں شکست بھی اس کے لیے ایک طرح کی خود آگہی بن جاتی ہے۔

؎ کر گیا سرمست مجھ کو ٹوٹ کر میرا سبُو(۲)

اقبال کے ہاں ابلیس کا کردار یک سطحی نہیں ہے۔ وہبیک وقت شر کا نمائندہ ہے، حرکت اور تصادم کا محرک ہے اور انسان کی خودی کے امتحان کا ذریعہ ہے۔ اقبال کی فکر میں زندگی اس وقت حسین ہوتی ہے جب یہ مزاحمت، انتخاب اور آزمائش سے گزرے۔ اگر کائنات میں ابلیس نہ ہوتا تو انسان کی خودی کا امتحان بھی باقی نہ رہتا۔ اس لیے نظم میں ابلیس کا فخر محض غرور نہیں بلکہ ایک فکری نکتہ بھی ہے۔ وہ جبریل کو یاد دلاتا ہے کہ تم ساحل سے خیر وشر کی جنگ دیکھتے ہو، مگر طوفان کے تھپیڑے میں کھاتا ہوں۔

جبریل سراپا اطمینان اور اطاعت ہے جب کہ ابلیس حرکت، خطرہ، انکار، تجربہ اور کشمکش کی علامت ہے۔ اس لیے ابلیس کا لہجہ جبریل سے زیادہ تند، متحرک اور ڈرامائی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اقبال ابلیس کو اخلاقی طور پر حق بجانب ٹھہراتے ہیں، بلکہ وہ اس کردار کے ذریعے کائنات میں شر اور کشمکش کے وجودی کردار کو نمایاں کرتے ہیں۔ اسی فکری پیچیدگی سے یہ نظم عام مذہبی نظم سے بلند ہو کر فلسفیانہ نظم بن جاتی ہے۔ پروفیسر وارث علوی لکھتے ہیں کہ:

> ''اقبال کی نظم ''جبریل وابلیس'' کی مثال عالمی ادب میں بھی مشکل سے ملے گی۔ ابلیس مغربی ادب میں بہت سی نظموں اور ڈراموں کا موضوع رہا ہے۔ لیکن اقبال کی اس نظم کی برابری کی کوئی چیز کہیں نظر نہیں آتی۔ ایسا لگتا ہے کہ گوئٹے، ورلین، برنارڈ شاہ وغیرہ نے اپنے ڈراموں کے ذریعے شیطان کے متعلق جو کچھ کہنا چاہا ہے اس سے کہیں زیادہ اور کہیں گہرا اقبال نے اپنی نظم میں سمو دیا ہے۔ معنی کے لحاظ سے یہ نظم سمٹا ہوا صحرا ہے۔ صدیوں پر پھیلے ہوئے اساطیر، عظیم مذاہب کے عقائد اور اسرار کائنات اور رموز حیات سے متعلق بڑے فلسفیانہ تصورات، تکوینی فکر کی ایک ایسی کرن میں بدل گئے ہیں جو نظم کے ہر لفظ کو ایک نئی بصیرت سے منور کرتی ہے۔''(۳)

اقبال کی زبان میں عربی، فارسی، قرآنی تلمیحات، فلسفیانہ تراکیب، خطیبانہ زور اور شعری ایجاز ایک ساتھ ملتے ہیں۔ پنجابی کا اپنا مزاج ہے؛ اس میں لوک رچاؤ، صوفیانہ دانش، صوتی روانی، زمین سے جڑا ہوا محاورہ اور لہجہ ہے۔ مترجم اقبال کی فکری بلندی کو پنجابی کے عوامی اور محاوراتی مزاج میں کیسے منتقل کرے؟ اگر وہ بہت زیادہ لفظی ترجمہ کرے تو پنجابی کی فطری روانی متاثر ہو گی؛ اگر وہ تخلیقی ترجمہ کرے تو اصل نظم کی فکری ساخت بدل جائے گی۔

'جبریل وابلیس' میں صرف لفظوں کے ساتھ ساتھ لہجوں کا ترجمہ بھی کیا جائے گا۔ جبریل کا لہجہ سوالیہ ہے اور اس میں ملکوتی سکون ہے۔ ابلیس کا لہجہ طنزیہ ہے اور شکست خوردہ ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ترجمہ کے بعد جبریل کا سوال، سوال ہی رہے، خطابت نہ بن جائے؛ اور ابلیس کا جواب بھی وہی چبھن، وہی فخر، وہی سرکشی اور وہی فکری پیچیدگی رکھے جو اصل نظم میں موجود ہے۔

ڈاکٹر احسان اکبر کے ترجمے میں پنجابی کا محاوراتی اور عوامی مزاج سامنے آتا ہے۔ وہ اقبال کے فارسی الفاظ کو پنجابی کے قریب تر الفاظ میں منتقل کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر اصل نظم کے آغاز میں جبریل کہتا ہے:

؎ہم دمِ دیرینہ ! کیسا ہے جہانِ رنگ و بو؟(۴)

ڈاکٹر احسان اکبر اس سوال کو پنجابی میں اس طرح ڈھالتے ہیں:

؎کہی جئی آ سنگی پرانیا! خوشبو تے رنگ دی ھتار؟(۵)

یہاں "ہم دمِ دیرینہ" کے لیے "سنگی پرانیا" نہایت بامعنی انتخاب ہے۔ اس سے جبریل اور ابلیس کے درمیان قدیم رفاقت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ 'جہانِ رنگ و بو' کو 'خوشبو تے رنگ دی ھتار' کہنا ایک مانوس، نرم اور فطری ترکیب بن جاتی ہے۔ لفظ 'ھتار' ٹھکانے یا جگہ کے معنی ادا کرتا ہے۔ جو کہ لفظ 'جہان' کے مقابلے میں کم وسعت کا حامل ہے۔ 'رنگ و بو' زیادہ وسیع حسی کائنات کی طرف اشارہ ہے جب کہ 'رنگ تے خوشبو' میں مقامیت کا احساس زیادہ ہے۔ یہاں ترجمہ اصل کے فلسفیانہ پھیلاؤ کو محسوس فضا میں لے آتا ہے۔

ابلیس جواب دیتا ہے:

؎سوز و ساز و درد و داغ و جستجوے و آرزو(۶)

ڈاکٹر احسان اکبر نے اس کا پنجابی میں یہ ترجمہ کیا ہے:

؎کُجھ سُر، کُجھ سڑ کن، پیڑ کُجھ، حسرت، کُجھ کھوج و چار(۷)

اس ترجمے میں 'سُر'، 'سڑ کن'، 'حسرت'، 'پیڑ'، 'کھوج' اور 'وچار' جیسے الفاظ آتے ہیں۔ ان الفاظ کا انتخاب پنجابی قاری کو اصل کیفیت کے قریب لے جاتا ہے۔ 'جستجو' کے لیے 'کھوج' اور 'آرزو' کے لیے 'حسرت' قریبی معنی رکھتے ہیں۔ تاہم یہاں 'درد و داغ' کی معنوی شدت کم ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر احسان اکبر ابلیس کو خشک فلسفیانہ کردار نہیں رہنے دیتے۔ وہ اس کی آواز کو پنجابی بول چال کے قریب لاتے ہیں جس سے ابلیس کی سرکشی قاری کے لیے قابلِ فہم بن جاتی ہے۔

جبریل کا سوال توبہ، رجوع اور اصلاح کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

ہر گھڑی افلاک پر رہتی ہے تیری گفتگو
کیا نہیں ممکن کہ تیرا چاکِ دامن ہو رفو؟(۸)

پنجابی ترجمے میں یہ سوال سادہ اور عام فہم بن جاتا ہے۔ جس سے اصل فکر کا ابلاغ تو ہو جاتا ہے مگر نظم کی مابعد الطبیعیاتی گہرائی کم ہو جاتی ہے۔

(تری سب توں وکھری ٹوہر سی جھڑی ہو گئی چوڑ چپٹ)
تری کہانی نِت اسمان تے کیوں رَلدا نہیں ترا پھٹ؟(۹)

اس شعر میں پہلا مصرع قوسین میں ہے یہ براہِ راست متن کا ترجمہ نہیں لیکن یہ اصل مفہوم کی تشریح میں مددگار ہے۔ یہ سوال کہ کیا ترجمہ میں فکر کے ابلاغ کے لیے اس طرح وضاحتی مصرعے یا اشعار کہے جا سکتے ہیں، بحث طلب معاملہ ہے۔ ہم یہ محتاط رائے قائم کر سکتے ہیں کہ اگر ترجمہ کے دوران ایسے وضاحتی اور تشریحی مصرعے کے بغیر فکر کا ابلاغ ممکن نہ ہو تو اسے ترجے کی مجبوری کے طور پر قبول کیا جا سکتا ہے۔ جس بات کو اقبال نے محض 'چاکِ دامن' کہہ کر مکمل کر دیا ہے۔ وہ اردو شاعری میں ایک روایت کا درجہ رکھتی ہے۔ جس میں ابلیس کے مردود ہونے کا سارا قصہ موجود ہے۔ اسی بات کو پروفیسر وارث علوی یوں لکھتے ہیں :

> "جبریل کے تخاطب میں اس ہمدردی کا بھی ہلکا سا شائبہ ہے جو ایک پر غرور اور سرکش ساتھی کی شکست اور سزا پر دوسرا محسوس کرتا ہے۔ ابلیس سے یہ پوچھنا کہ تم کیسے ہو زخموں پر نمک چھڑکنا ہے، بعینہ ویسے ہی جیسے پردیس کو گئے اور ناکام و نامراد لوٹے ہوئے رفیق سے پوچھنا کہ کیسے ہو۔ ایسے مواقع پر شخصی کی بجائے غیر شخصی سوال زیادہ خلیقانہ ہوتا ہے کہ کیسا لگا تمھیں نیا ملک ؟ اور پھر ملک کے تذکرے میں سرگذشت بھی بیان ہو جاتی ہے چنانچہ جبریل پوچھتے ہیں کیسا ہے جہان رنگ و بو اور اس خاک داں کے لیے 'جہان رنگ و بو' کی ترکیب بہت ہی خوبصورت اور معنی خیز ہے لیکن جبریل کی زبانی ادا ہوتے ہوئے اس میں ہلکے سے طنز کا شائبہ پیدا ہو جاتا ہے کہ جس عالم نور اور عالم جاوداں کے وہ باسی ہیں اور جہاں سے خود ابلیس کو دیس نکالا ملا ہے اس کے مقابلے میں معمورۂ جہاں محض رنگ اور بو کا کیا پر فریب اور ناپائدار طلسم خانہ ہے۔"(۱۰)

ڈاکٹر احسان اکبر کے ترجمے میں ابلیس ایک فعال کردار کے طور پر سامنے آتا ہے۔ وہ انسانی ارادے، عقل، خواہش، فتنے اور امتحان کے پورے نظام میں شامل ہے۔ جب وہ جبریل سے کہتا ہے کہ تو ساحل سے خیر و شر کی جنگ دیکھتا ہے، اصل طوفان میں مَیں ہوں، وہاں ڈاکٹر احسان اکبر کا ترجمہ بھی اسی فکری تقابل کو برقرار رکھتا ہے۔

توں کنڈھے بیٹھ کے ویکھنی چنگیاں مندیاں دی جنگ
تَیں چنڈیا نہیں طوفان نے ترا نال مِرے کی سنگ(۱۱)

نظم کے آخری دو مصرعے علامہ اقبال کے تصورِ حرکت و جمود کی نہایت مؤثر پیش کش ہیں۔ ایسے مقام پر مترجم کو خاص احتیاط برتنی ہوتی ہے۔ ابلیس نہایت بلند جذبے اور انا کے ساتھ جبریل سے مخاطب ہے:

میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ہُو، اللہ ہُو، اللہ ہُو!(۱۲)

اس شعر کے ترجمے میں 'یزداں' فارسی الاصل لفظ ہے اس کے معنی نیکی اور اچھائی کے خدا کے ہیں۔ جس کا متضاد 'اہرمن' ہے جو کہ بدی اور برائی کا خدا ہے۔ احسان اکبر نے اس کا ترجمہ 'حق' کیا ہے جو کہ قرآنی اصطلاح ہے۔ اس ترجمے سے فکر کا ابلاغ اپنے اصل متن سے بھی زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔

سینے وچ حق دے رڑکنا میں ہر گھڑے ہر جُوہ
توں اگلا ورق نہ تھلیا اجے پڑھنا ایں 'اللہ ھو'(۱۳)

اس شعر میں ابلیس اپنی آزادی، خود مختاری اور انا کا برملا اظہار کر کے جبریل کو نیچا دکھانا چاہتا ہے۔ ترجمے میں ڈاکٹر احسان اکبر نے اسے مؤثر انداز میں بیان کیا ہے۔

اسیر عابد کا ترجمہ ڈاکٹر احسان اکبر کے مقابلے میں زیادہ سنجیدہ، نسبتاً لفظی اور اقبالی فضا کے قریب محسوس ہوتا ہے۔ وہ پنجابی کو محض عوامی محاورے میں نہیں ڈھالتے بلکہ اس میں فکری گہرائی قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے ہاں اقبال کے اصل الفاظ کی گونج زیادہ سنائی دیتی ہے۔ وہ نظم کی فلسفیانہ سطح کو ہلکا نہیں کرتے بلکہ کوشش کرتے ہیں کہ ابلیس کا لہجہ اپنی اصل فکری سختی کے ساتھ پنجابی میں منتقل ہو۔

اسیر عابد کے ترجمے میں 'ہم دم دیرینہ' کا ترجمہ 'دیر دیا سنگیا' سامنے آتا ہے۔ یہاں بھی رفاقت کا قدیم احساس موجود ہے۔

ویر دے سنگیا! کیہ جگ پھُلواڑی دے نیں چالے
رسماں! (۱۴)

اسیر عابد کے ہاں اصل الفاظ کے معنوی حلقے کو بچانے کی کوشش زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ وہ 'سوز'، 'درد'، 'داغ'، 'جستجو' اور 'آرزو' کی فکری گرمی کو پنجابی میں آسان بنانے کے بجائے نسبتاً بلند سطح پر قائم رکھتے ہیں۔

سینے سیک تے چھیک کلیجے، درد، وچھوڑے، کھوجاں
، سدھراں (۱۵)

اسیر عابد کے ترجمے کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ ابلیس کا لہجہ یہاں زیادہ فکری اور خطیبانہ رہتا ہے۔ وہ اپنی شکست کو بھی فلسفیانہ اعتماد کے ساتھ بیان کرتا ہے۔

حیف اے جبرائیلا! توں نئیں اُکّا وِچلا بھیت پچھاتا
میری آپ صراحی ٹُٹ کے دے گئی مینوں نشے خماراں
(۱۶)

جب وہ اپنی جرأت، فتنہ انگیزی، عقل و خرد کے نظام، اور خاکِ انسانی میں نمو کے ذوق کی بات کرتا ہے تو ترجمہ بھی اصل نظم کی فضا کو برقرار رکھتا ہے۔ اسیر عابد کے ہاں ابلیس ایک عوامی کردار نہیں بنتا بلکہ ایک شعری اور فکری کردار رہتا ہے۔۔

میری ہِمتوں مٹّی دی مُٹھ نوں وَدھنے پھُلنے دیاں ریجھاں
میرے ایسے فتنے عقلاں فکراں والیاں تانیاں تنیاں
(۱۷)

اسیر عابد نے قرآنی اشاروں کو بہت زیادہ عوامی بنادیا ہے۔ 'تقنطو' اور 'لاتقنطو' جیسے قرآنی الفاظ کا ترجمہ 'مایوسی' اور 'آس امیداں' جیسے الفاظ سے کر کے فکری طور پر محدود کر دیا ہے۔ جب کہ یہ الفاظ اپنا ایک خاص پس منظر رکھتے ہیں جس میں ان کے معانی آفاقی ہو جاتے ہیں۔

کن پیارے دے من اگاں لائیاں نیں جس دی مایوسی
اوہدے حق مایوسی چنگی اے یا چنگیاں آس امیداں (۱۸)

ابلیس کے انکار و تکبر سے متعلق فضا کو اسیر عابد نسبتاً اصل کے قریب رکھتے ہیں۔ اس سے نظم کی مذہبی اور فکری سنجیدگی محفوظ رہتی ہے۔ ترجمہ قاری کو یہ یاد دلاتا رہتا ہے کہ یہ محض دو کرداروں کی گفتگو نہیں بلکہ خیر و شر، اطاعت و انکار، آزمائش و اختیار، اور حرکت و جمود کا مسئلہ ہے۔

شر تے خیر دی بھڑنی توں بس کنڈھے تے بیہہ ویکھی
جائیں
جو چھلّاں دیاں سٹّاں سہندا جاندا اے اوہ توں کہ مَیں آں (۱۹)

اس نظم کے آخری دو مصرعے جو اس نظم کا مرکزی خیال ہیں، میں اقبال نے ابلیس کی فعالیت جو پوری شدت سے بیان کیا ہے۔ اس کے ترجمے میں اسیر عابد نے لفظی ترجمہ کے ذریعے فکر کا ابلاغ کیا ہے۔

میں تے رب دے سینے وچ پیا رڑکاں کنڈے وانگوں
بھلیا
توں بس اللہ ھُو، اللہ ھُو، اللہ ھُو، دیاں پائیں جلیاں (۲۰)

اسیر عابد کے ترجمے میں فکری ابلاغ کو مؤثر بنانے کے لیے خالص فارسی تراکیب و استعارات کو مقامی پنجابی علامتوں سے بدل گیا ہے۔ یم سے یم، دریا سے دریا، جُو سے جُو کو فارسی تہذیبی روایت سے نکال کر مقامی پنجابی روایت میں بیان کرتے ہیں۔

نین پران الیاس دے ہِلّن نہ ہتھ پیر خضر دے ہِلّن
راوی راوی، جھمبر جھمبر، نہرے نہرے میریاں کانگاں
(۲۰)

دونوں تراجم کے تقابلی مطالعے سے سب سے پہلے یہ بات سامنے آتی ہے کہ دونوں مترجمین نے اقبال کی نظم کے بنیادی فکری نظام کو سمجھا ہے، مگر اس کی ترسیل کا طریقہ الگ ہے۔ ڈاکٹر احسان اکبر کا ترجمہ پنجابی کے زیادہ مانوس، رواں اور محاوراتی انداز میں ہے جب کہ اسیر عابد نے کی سنجیدگی اور فلسفیانہ فضا برقرار رکھتے ہوئے کیا ہے۔
'جہانِ رنگ و بو' کے ترجمے میں ڈاکٹر احسان اکبر 'خوشبو تے رنگ دی ٹھار' جیسی ترکیب سے اسے حسی بنا دیتے ہیں۔ اسیر عابد 'جگ پھُلواڑی' کہ کر اصل کے قریب رکھتے ہیں۔ اس فرق سے دونوں کے مزاج کا اندازہ ہوتا ہے۔

اسلوبیاتی اعتبار سے ڈاکٹر احسان اکبر کے ترجمے میں روانی، سادگی، محاوراتی چاشنی اور پنجابی آہنگ زیادہ ہے۔ وہ اقبال کے مشکل الفاظ کو آسان بناتے ہیں اور فلسفیانہ تراکیب کو محسوس پیکروں میں ڈھالتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ترجمہ قاری کو فوری طور پر متوجہ کرتا ہے۔

اسیر عابد کا اسلوب زیادہ سنجیدہ، مرکوز اور فکری ہے۔ وہ اقبال کی فضا کو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اسیر عابد نے مکمل بالِ جبریل کا پنجابی ترجمہ کیا ہے۔ ان کے پیش نظر چند نظموں کا انتخاب نہیں تھا۔ اس سے ترجمہ ایک علمی اور فکری رنگ اختیار کرتا ہے۔ البتہ اس کی وجہ سے پنجابی کی عوامی شیرینی نسبتاً کم ہو جاتی ہے۔ قاری کو کئی مقامات پر نظم کی فکری تہ تک پہنچنے کے لیے ذرا رک کر پڑھنا پڑتا ہے۔

دونوں تراجم میں مکالماتی اسلوب کی ترسیل بھی الگ الگ انداز سے ہوئی ہے۔ ڈاکٹر احسان اکبر سوال و جواب کو بول چال کے قریب لاتے ہیں۔ ان کے ہاں جبریل اور ابلیس کی گفتگو ایک زندہ مکالمہ بن جاتی ہے۔

گئی رُڑھ اِنکھ انکار وچ تیری کیسی اُچّی آن
ہن عرشیاں دی کیہ رہ گئی اللہ دی اکھ وچ شان!(۲۱)

اسیر عابد مکالمے کو زیادہ فکری سطح پر رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں گفتگو کی ڈرامائیت کم اور فکری گہرائی زیادہ ہے۔

منکر ہو کے توں ابلیسا اُچّے محل مناریوں ڈگوں
رب دیاں نظراں وچ ملائک جنس دیاں کیہ رہیاں
قدراں (۲۲)

صوتی سطح پر بھی ڈاکٹر احسان اکبر کے ہاں الفاظ کی روانی اور لوک آہنگ زیادہ محسوس ہوتا ہے۔ 'سنگی پرانیا'، 'خوشبو تے رنگ'، 'کھوج وچار' جیسے الفاظ قاری کو مانوس فضا دیتے ہیں۔ اسیر عابد کے ہاں صوتی سادگی کے بجائے فکری دباؤ زیادہ ہے۔ وہ ایسے الفاظ کو ترجیح دیتے ہیں جو اصل متن کی معنوی تہ کو بچا سکیں مثلاً: 'جگ پھلواڑی، حیف اے جبرائیلا، نشے خماراں وغیرہ۔

اس نظم کا اصل امتحان ابلیس کے لہجے میں ہے۔ جبریل کے سوالات نسبتاً مختصر اور واضح ہیں، مگر ابلیس کے جوابوں میں کئی رنگ جمع ہیں۔ وہ طنز کرتا ہے، اپنی شکست کو یاد کرتا ہے، اپنی سرمستی پر ناز کرتا ہے، عالمِ بے کاخ و کو سے بیزاری ظاہر کرتا ہے۔ اگر مترجم ابلیس کے لہجے کو کمزور کر دے تو پوری نظم کا توازن بگڑ جاتا ہے۔

ڈاکٹر احسان اکبر ابلیس کے لہجے کو پنجابی کی محاوراتی قوت سے زندہ کرتے ہیں۔ ان کے ہاں ابلیس کی بات میں تندی ہے۔ وہ ایک ایسا کردار بن جاتا ہے جس کی بات پنجابی قاری فوراً سمجھ سکتا ہے۔

ےکدے لہو دی لالی پھِر گئی مکھڑے تے آدم دے(۲۳)

اسیر عابد ابلیس کے لہجے کو زیادہ بلند اور فکری رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں ابلیس کم عوامی اور زیادہ اقبالی کردار ہے۔

آدم دے قصّے نوں چار رنگ لایا کِدھیاں رَت پھوہاراں(۲۴)

'جبریل و ابلیس' کی تہہ میں قرآنی روایت موجود ہے۔ ابلیس کا انکار، اس کا آدم کے سامنے سجدہ نہ کرنا، اس کی مہلت، اس کا انسان کو بہکانے کا دعویٰ، اور آخر کار خیر و شر کی کشمکش، یہ سب نظم کے مکالموں میں بین السطور بیان ہوا ہے۔ مترجم کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس قرآنی فضا کو محفوظ رکھے۔

ڈاکٹر احسان اکبر قرآنی اور فلسفیانہ اشاروں کو اپنی اصل شکل میں برقرار رکھتے ہیں۔

بنے رُوح دی ننگھی پیڑ جھدے پھکے ہوئے ساڑ دا سیک

اساں 'تقنطو' یا لا 'تقنطو' کہناں حرفاں دینی ٹیک(۲۵)

اسیر عابد ان اشاروں کو آسان مترادفات سے بدلتے ہیں۔

کن پیارے دے من اگاں لائیں نیں جس دی مایوسی

اوہدے حق مایوسی چنگی اے یا چنگیا آس امیداں (۲۶)

ڈاکٹر احسان اکبر کے ترجمے میں روانی اور ابلاغ زیادہ ہے۔ یہ ترجمہ پنجابی محاورے کے عین مطابق ہے۔ اُن کی زبان میں نرمی، لچک اور لوک آہنگ ہے۔ نظم کا مکالمہ زیادہ زندہ اور مانوس ہے۔

اسیر عابد کا ترجمہ اصل نظم کے فکری نظام سے زیادہ قریب ہے۔ وہ اقبال کے ابلیس کو محض پنجابی محاورے میں نہیں ڈھالتے بلکہ اس کی فکری اور علامتی حیثیت کو برقرار رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں ابلیس کا لہجہ زیادہ بلند، زیادہ فلسفیانہ اور زیادہ سنجیدہ ہے۔ تاہم اس کے نتیجے میں ترجمہ کہیں کہیں کم رواں اور کم عوامی محسوس ہوتا ہے۔ یہ ترجمہ عام قاری سے زیادہ سنجیدہ قاری کو متوجہ کرتا ہے۔ ان تراجم کو ایک دوسرے کا بدل نہیں بلکہ ایک دوسرے کی تکمیل کے طور پر دیکھنا چاہیے۔

علامہ اقبال کے پنجابی تراجم کو صرف لفظی وفاداری کے معیار پر نہیں پرکھا جا سکتا۔ اس میں اقبال کی فکر، لہجے، علامت اور شعری فضا کی ترجمانی بھی شامل ہے۔ اس معیار پر دونوں تراجم اپنی اپنی سطح پر قابلِ توجہ ہیں۔ ڈاکٹر احسان اکبر نے نظم کو پنجابی کی زندہ بول چال اور محاورے سے قریب کیا، جب کہ اسیر عابد نے اس کی فلسفیانہ اور اقبالی فضا کو زیادہ سنبھال کر رکھا۔ اس لیے 'جبریل و ابلیس' کے یہ دونوں پنجابی تراجم اقبال فہمی اور پنجابی ترجمہ نگاری، دونوں حوالوں سے اہم مطالعے کا تقاضا کرتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ اقبال، کلیاتِ اقبال اُردو، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۱۸، ص ۴۴۷
۲۔ ایضاً ص ۴۷۳
۳۔ وارث علوی، پروفیسر، "علامہ اقبال کی نظم مکالمہ جبریل و ابلیس" (مشمولہ ادبی میراث، اکتوبر ۲۰۲۱ء
۴۔ اقبال، کلیاتِ اقبال اُردو، اقبال اکادمی پاکستان، ص ۴۷۳
۵۔ احسان اکبر، ڈاکٹر، علامہ اقبال کی منتخب نظمیں (پنجابی ترجمہ)، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، سن ندارد، ص ۶۱
۶۔ اقبال، کلیاتِ اقبال اُردو، اقبال اکادمی پاکستان، ص ۴۷۳
۷۔ اقبال، کلیاتِ اقبال اُردو، اقبال اکادمی پاکستان، ص ۴۷۳
۸۔ اقبال، کلیاتِ اقبال اُردو، اقبال اکادمی پاکستان، ص ۴۷۳
۹۔ احسان اکبر، ڈاکٹر، علامہ اقبال کی منتخب نظمیں (پنجابی ترجمہ)، اکادمی ادبیات پاکستان، ص ۶۱
۱۰۔ وارث علوی، پروفیسر، "علامہ اقبال کی نظم مکالمہ جبریل و ابلیس" (مشمولہ ادبی میراث، اکتوبر ۲۰۲۱ء
۱۱۔ احسان اکبر، ڈاکٹر، علامہ اقبال کی منتخب نظمیں (پنجابی ترجمہ)، اکادمی ادبیات پاکستان، ص ۶۳
۱۲: اقبال، کلیاتِ اقبال اُردو، اقبال اکادمی پاکستان، ص ۴۷۴
۱۳: احسان اکبر، ڈاکٹر، علامہ اقبال کی منتخب نظمیں (پنجابی ترجمہ)، اکادمی ادبیات پاکستان، ص ۶۳
۱۴۔ اسیر عابد، جبریل اڈاری، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۴، ص ۳۹۹
۱۵: ایضاً
۱۶: ایضاً
۱۷: ایضاً ص ۴۰۱
۱۸: ایضاً ص ۴۰۱
۱۹: ایضاً ص ۴۰۳
۲۰: ایضاً ص ۴۰۳
۲۱: احسان اکبر، ڈاکٹر، علامہ اقبال کی منتخب نظمیں (پنجابی ترجمہ)، اکادمی ادبیات پاکستان، ص ۶۳
۲۲: اسیر عابد، جبریل اڈاری، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۴، ص ۴۰۱
۲۳۔ احسان اکبر، ڈاکٹر، علامہ اقبال کی منتخب نظمیں (پنجابی ترجمہ)، اکادمی ادبیات پاکستان، ص ۶۳
۲۴۔ اسیر عابد، جبریل اڈاری، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۴، ص ۴۰۳
۲۵۔ احسان اکبر، ڈاکٹر، علامہ اقبال کی منتخب نظمیں (پنجابی ترجمہ)، اکادمی ادبیات پاکستان، ص ۶۳
۲۶۔